Article

Concept of God and Urdu Poetry

تصورِ خدا اور اُردو شاعری

Aftab Nawab *[1]
Lecturer, Department of Urdu,Government Associate College Minchan Abad

آفتاب نواب[1]
لیکچرار، شُعبہ اُردو، گورنمنٹ ایسوسی ایٹ کالج، منچن آباد

Correspondanance: aftabnawab96@gmail.com

eISSN:**3005-3757**
pISSN: **3005-3765**

Received: 21-10-2024
Accepted:22-12-2024
Online:25-12-2024

Copyright:© 2023 by the authors. This is an access-openarticle distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

Abstract: The concept of God holds a central and prestigious place in literary themes. This conception is not linear by any means, and has evolved greatly over the span of centuries. Similarly, in Urdu poetry, almost all the poets have shed a considerable amount of attention to this theme, but it has resulted in a diversified conception of God due to difference of each individual's distinctive worldview. This article will focus on the evolution of this concept by comparing the thematic representation of prominent Urdu poets.

KEYWORDS: Concept of God, Literary Themes, Urdu Poetry, Urdu poets , History of Literature, Techniques.

قدیم ترین انسانی تاریخ سے لے کر تا حال ایک بھی ایسی انسانی بستی دریافت نہیں ہوئی جہاں کسی مافوق الفطرت ہستی کا کوئی تصور نہ پایا جاتا ہو۔ ہر دور، ہر جغرافیائی خطے اور ہر ثقافت میں انسان نے اپنی علمی استعداد اور شعوری قوت کے مطابق خدا کے کئی نظری اور مادی روپ ایجاد کیے۔ سب سے پہلے انسان کے ذہن نے تصورِ خدا کو کب جنم دیا یہ جاننے کے لیے انسان کی عمر کے متعلق اندازہ لگانا بہت ضروری ہے۔

علم الانسان(anthropology) کی رو سے انسان کی قابلِ شناخت نیم انسانی صورت تقریباً تیس لاکھ سال پہلے وجود رکھتی تھی اور یہ انسان سیدھا چلتا تھا۔ ہاتھوں کی ساخت تشکیل پا چکی تھی، وہ پتھر کے اوزاروں کا استعمال جانتا تھا، خوراک کا انتظام اجتماعی طور پر کیا جاتا تھا۔ پھر انسان کی اس سے بھی بہتر شکل ہوموایریکٹس (Homo Erectus) پانچ لاکھ سال پہلے ملتی ہے۔ جب وہ آگ کا استعمال جانتا تھا، غاروں میں سکونت پذیر تھا اور یکساں زبان میں ابلاغ کرتا تھا۔ اس انسان کے دماغ کا حجم آج کے انسان کے دماغ کے مساوی تھا۔

عراق، چین اور یورپ کے کچھ علاقوں میں قدیم ترین مافوق الفطرت خیالات کے شواہد آثارِ قدیمہ کی تحقیق کے مطابق ایک لاکھ سال سے پینتس ہزار سال قبل تک ملتے ہیں۔ اس قدیم ترین انسان کی ایک شاخ کو Neanderthal کہتے ہیں۔ مُردوں کو دفن کرنے کے مقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ انسان مذہبی خیالات کا مالک تھا ایسے مذہبی خیالات کا مالک جن کا تعلق موت سے ہے۔ یہ شہادتیں بھی میسر آئی ہیں کہ وہ انسان موت کو کسی دوسری دنیا میں جانے کا راستہ خیال کرتا تھا اور یہ ہمیشہ انسان کا بنیادی عقیدہ رہا ہے۔ جدید نوعِ انسانی جسے ہوموسیپنز کہا جاتا ہے کا آغاز پچاس ہزار سال پہلے ہوا۔ یہ عہد Paleolithic Period کہلاتا ہے۔ اس عہد میں آثارِ قدیمہ سے ملنے والے مجسموں کے مطابق ایک عظیم ماں کا تصور ملتا ہے جو زمین پر زندگی کے سرچشمے کو ظاہر کرتا ہے۔ اس کا یہ معنی بالکل سامنے ہے کہ ایک زمانے میں نسوانی خدا کا تصور بھی رائج رہا ہے۔ یہ انسان کی اس فکر اور مشاہدے کا نتیجہ ہے کہ عورت پیدا کرتی ہے لہذا کائنات کو پیدا کرنے والی ہستی بھی یقیناً عورت (نسوانی خدا/ دیوی) ہی ہے۔

تقریباً 8000 سال پہلے انسان نے کاشت کاری کا فن سیکھ لیا تھا اور فصلیں اگانے لگا تھا۔ زراعت کے اس عہد میں انسانی فکر میں بہت تبدیلیاں رونما ہوئیں، اس نے بستیاں بسائیں اور یوں اسکے ایک قدیم کلچر جسے ایگری کلچر کہتے ہیں کا آغاز ہوا۔ اس عہد کے انسان نے مادرِ ارض کا تصور تراشا بعد ازاں تحریر کی ایجاد اور مصر، یورپ، افریقہ، عراق اور چین میں کئی تہذیبوں کا جنم ہوا اور بعد میں لوہے کے زمانے میں موجودہ مذہبی تصورات کے نقوش ملتے ہیں۔

اس تاریخی بحث سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ انسان کی سماجی عمر کے مقابلے میں اسکی مذہبی عمر کافی کم ہے۔ ان زمانوں کا موجودہ زمانے کے مذہبی خیالات سے کوئی خاص تعلق نہیں بن پاتا۔ عبادت گاہوں کی تعمیر یا منظم مذہبی روایت کا قیام بہت بعد میں ہوا۔ قدیم انسان فطرت اور فطرت کے مظاہر کے سامنے لاچار تھا، وہ اپنے گرد و پیش کا پس

منظر نہیں جانتا تھا اور نہ ہی اسے اشیا کا علم تھا۔ انسان اور فطرت کی اسی کشمکش سے کئی دیومالائی کہانیاں وجود میں آتی چلی گئیں۔

گوپی چند نارنگ کے بقول:

> "قدیم انسان فطرت سے خوف زدہ بھی تھا اور حیرت زدہ بھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کے گرد و پیش میں دیو ہیکل فطرتی مظاہر کیا ہیں اور کیوں ہیں۔ ان سوالوں پر غور و فکر توکل کی بات ہے۔ قدیم انسان تو اپنے پاس پڑوس سے یا حیران ہوا یا پریشان۔ دیو مالائی قصے کہانیوں میں موجود حیرت اسی قدیم انسان کی حیرت ہے۔"(1)

گوپی چند نارنگ کی اس بات کو دیکھا جائے تو دیومالا اور چند مذہبی عناصر کا تعلق بنتا ہوا نظر آتا ہے۔ انسان نے انہی مظاہر میں سے اپنے لیے خدا بھی تراشے اور جیسے جیسے ان مظاہر کی تعداد بڑھی ان خداؤں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اس اضافے کا محیط دیویوں اور دیوتاؤں کے طفیل کئی سو ہستیوں تک پھیلا ہوا ہے۔ جن میں بادشاہ بھی خدا یا دیوتا ہونے کا دعوی کرتے چلے آئے ہیں اور انسان اس دعوے پر سر تسلیم خم بھی کرتا چلا آیا ہے۔ اس تصور کے ساتھ پیغمبری کا تصور بھی رفتہ رفتہ طلوع ہونے لگا اور 1750 قبل مسیح میں حمورابی (جو بابل کا بادشاہ تھا) نے دیوتاؤں کی ہدایات پر عمل درامد کرانے اور کرنے کا کام شروع کیا۔ اس سلسلے میں ارشد محمود کا ایک قتباس ملاحظہ کریں:

> "1750 قبل از مسیح میں بابل کے ایک بادشاہ حمورابی نے دعوی کیا تھا کہ اسے دیوتاؤں نے بلا کر کہا ہے کہ وہ زمین پر انصاف کرے۔ بدی اور بدمعاشی کا خاتمہ کرے تاکہ طاقتور کمزور کو کچل نہ سکے۔ گویا پیغمبری کا تصور بھی ابھرنے لگا تھا۔" (2)

یہاں جو پیغمبری کے تصور کی بات کی گئی ہے اسکا معنی یہ ہے کہ دیوتاؤں نے انسان سے براہ راست گفتگو کرنا ترک کر کے انسان اور اپنے درمیان ایک پیامبر کا انتخاب کر لیا ہے۔

کلاسیکی مذاہب کے باب میں یونان میں بہت وسیع اور وقیع روایت پائی جاتی ہے۔ یونانی تہذیب فلسفہ، آرٹ، ادب اور سیاست میں بہت بھرپور سرمائے کی حامل ہے۔ یونانی تصورِ خدا یہ رہا کہ زیوس نے سب انسانوں کو پیدا کیا ہے اور ان کی نیکیاں اور برائیاں دیکھ رہا ہے اور پھر انہیں انکے اعمال کی جزا یا سزا دے گا۔ یونانی دیوتاؤں کی ایک خاص بات یہ تھی کہ وہ انسانوں جیسے تھے لیکن وہ حسن و جمال میں انسانوں سے کہیں بڑھ کر تھے، لافانی تھے اور غم و آلام سے ماورا تھے۔ کچھ دیوتا اولمپس پہاڑ پر بیٹھ کر دنیا پر حکمرانی کرتے، کچھ زمینی معاملات اور موت وغیرہ کے معاملات کو دیکھتے تھے۔

یونانی تہذیب میں وہ زمانہ نہایت اہم فکر سے بھرپور ہے جب جب اس میں فلسفیانہ فکر کا ارتقا ہوا اور صاحبانِ فکر اہلِ یونان نے ان دیوی دیوتاؤں کی حرکات اور غم و غصے پر سوال اٹھانا شروع کر دیے۔ یہیں سے انسان کی فکر کا ایک نیا

دور شروع ہوا۔ جب سقراط نے لوگوں کو سکھایا کہ وہ ہر چیز کے بارے میں تنقیدی زاویہ اختیار کریں اور تنقیدی انداز میں سوچیں۔ چنانچہ اسے مذہب مخالف قرار دے کر سزائے موت دے دی گئی۔

ہم نے دیکھا کہ کن زمینی حالات میں انسانی ذہن میں خدا کا تصور ابھرا اور کس طرح اس تصور نے ارتقاء پایا۔ تاریخِ انسانی بتاتی ہے کہ دنیا کی دیگر تمام مادی اشیاء اور غیر مادی اشیاء ہی کی طرح مذاہب بھی جنم لیتے رہے، انسان کو متاثر کرتے اور حالات کے تبدیل ہونے سے نئے نئے مذہب اور ضابطہ ہائے زندگی پیدا ہوتے رہے اور لوگوں کی فکری و معاشرتی ضرورتوں کو پورا کرتے رہے۔ فی زمانہ سائنس کا عنصر بھی مذہب میں یوں داخل ہوا ہے کہ اس نے انسانی فکر کا دھارا بدل کر رکھ دیا ہے۔ انسان اپنے اور کائنات کے بارے میں بہت کچھ جان چکا ہے سو اب اندھے عقائد کے دن نہیں رہے۔ ہر نظریہ عقلی معیارات پر پرکھا جاتا ہے۔ انسان کے اول ترین عہد سے لے کر اب تک جتنے بھی مذاہب سامنے آئے وہ بظاہر ہر طرح سے مختلف بھی ہوں تب بھی ان کا مرکزی نقطہ ایک ہی رہا ہے اور وہ وہی انسانی واہمہ ہے جو انسان کی تمام فکر میں کارفرما رہا ہے۔

پہلے پہل ہر چیز کو ذی روح سمجھا گیا اور آخر کار تمام کائنات میں جاری و ساری اک عظیم ترین روح کا تصور سامنے آیا۔ اس سلسلے میں وحید عشرت کا کہنا ہے کہ:

> "کائنات کے ذرے ذرے میں جاری و ساری ایک عظیم روح کا تصور اتنا سطحی نہیں ہے یہ عقلی سطح پر بھی مطمئن کرنے والا تصور ہے۔" (3)

اول اول انسان کا اشیاء کو پوجنا خود کو ان اشیاء کے غم و غصے اور ان سے پہنچنے والے نقصان سے بچنے کے لیے تھا۔ فائدہ دینے والی اشیاء کو پوجنا بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ لیکن جب انسان کو معلوم ہوا کہ یہ اشیاء نہ شعور رکھتی ہیں اور نہ سوچتی ہیں تو اسی احساس کے ساتھ حقیقت کو جاننے کا تجسس بھی پیدا ہوا۔ یہی انسان کے سائنسی شعور کا جنم ہے۔ بقول ارشد محمود

> " ۔۔۔ روز مرہ عملی تجربات کے ساتھ حقیقت حال کو جاننے کا عمل بھی شروع ہو گیا جو سائنسی علم کی ابتدا تھی۔ یعنی سائنس اور وہم ساتھ ساتھ متوازی چلنے لگے" (4)

آگے چل کر مزید لکھتے ہیں کہ:

> "بقائے حیات (Survival) کا جبلی تقاضا انسان کو اپنے ماحول (فطرت) کے ساتھ برسرپیکار رکھتا۔ وسیع و عریض اور ہیبت ناک فطرت کے مقابل انسان کی حالت نہایت کمزور تھی۔ چنانچہ اس نے فطرت کے مقابل اپنی خیالی (وہمی) قوت کو استعمال کیا۔ وہم، بے علمی کے نتیجے میں پیدا کردہ

خوف سے جنم لیتا ہے لیکن علم کے آجانے سے خوف بھی ختم ہو جاتا ہے اور
وہم بھی۔'' (5)

مندرجہ بالا آرا سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان ابتدا میں فطرت کے خلاف اپنی بقا کے لیے جنگ و جدل کی حالت میں رہنے کے ساتھ ساتھ اس سے ڈر کر اور خوف کھا کر اس کے سامنے سجدہ ریز بھی ہوتا رہا ہے۔ تاہم اس سب صورتحال کو وقت کے ساتھ ساتھ علم اور عقلی تجزیے نے تبدیل کیا۔ فی زمانہ خدا کا تصور عقلی تجزیے کے بعد مانا جاتا ہے اگرچہ اس کے خلاف بھی فلسفیوں نے کئی طرح کے دلائل اکٹھے کیے اور انکار بھی کیا۔

دنیا میں حصولِ علم کے اب تک دو طریقے مقبول ہیں، پہلا یہ کہ چیزوں کو ویسے ہی دیکھا جائے جیسی وہ نظر آتی ہیں۔ اس طریقے میں کسی شے کے بارے میں سوالات کے جوابات اُسی شے سے طلب کیے جاتے ہیں۔ یعنی وہ شے کیسی ہے، وہ شے کیسے بنی ہے، وہ شے کہاں سے آئی ہے، ایسے میں ان سوالوں کے جواب خود وہ شے مہیا کرتی ہے۔ مشاہدے اور ظاہری تجزیے کی بنا پر اس طریقے کو معروضی طریقہ کہا جاتا ہے۔

دوم یہ ہے کہ کسی سوال کا جواب قیاس اور خیال پر مبنی ہوتا ہے ایسے میں انسان کی اپنی پسند و ناپسند، سماجی، سیاسی اور خاندانی تعصبات شامل حال رہتے ہیں۔

پہلے طریقے کا تعلق تحقیق اور جدوجہد سے ہے۔ دوسرا طریقہ کار محض انسانی خیالات پر مبنی ہوتا ہے اور اسے خطرناک سمجھا جاتا ہے کیونکہ اس کے ذریعے انسان غلط نتائج نکال کر عمر بھر ان کا قائل رہتا ہے اور علم کا راستہ بند کر بیٹھتا ہے۔

آج خدا کا جو تصور عوام الناس میں موجود ہے اور جس طرح اسے پیش کیا جاتا ہے، اس تصور کے مطابق تو خدا ایک شخصیت (Person) کے طور پر سامنے آتا ہے مثلاً وہ غصہ کرتا ہے، بولتا ہے، دوستی رکھتا اور دشمنی بھی رکھتا ہے۔ انعام بھی دیتا ہے اور سزا بھی۔ انسانوں کے پل پل کی خبر رکھتا ہے جو اسے پسند نہ آئے اسے ہدایت بھی نہیں دیتا اور جو پسند آئے اسے سب کچھ سے نواز دیتا ہے۔ آج اگر ہم کسی سے یہ سوال کریں کہ آپ کا خدا پر ایمان کیوں ہے؟ تو عموماً اس کا جواب یہ ہو گا کہ کسی کے بنائے بنا دنیا میں کوئی بھی چیز نہیں بن سکتی، اس لیے اس دنیا کو بنانے والی اور پیدا کرنے والی کوئی ہستی تو ضرور ہے پس وہی خدا ہے۔ غور سے دیکھیں تو مذکورہ دلیل صرف ایک مفروضہ ہے اور یہ دلیل مزید خود اسی مفروضے پر اطلاق پا جائے گی اور مفروضے یا تصور پر رکنا قطعاً انصاف نہیں ہو گا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر علی عباس جلالپوری کا کہنا ہے کہ

''اگر ہم نے ایک تصور اور مفروضے پر جا کر رک جانا ہے تو اس کائنات پر ہی
کیوں نہیں رک جاتے۔''(6)

سائنس چونکہ تحقیق و تفتیش کے طریقے کو اپناتی ہے اور بنائے بنائے سانچوں یا خیالات پر قانع نہیں ہوتی لہذا یہاں راستہ ذرا صبر آزما ہوتا ہے اور دوسرے طریقے کے قائل طبقات کی طرف سے رد کر دیے جانے کا معاملہ الگ سے

دامن گیر رہتا ہے۔ اس سب کے باوجود یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ سائنسی علم کو دنیا میں کہیں بھی پرکھا جا سکتا ہے اس لیے اسکی نوعیت عالمگیر ہے۔ اس رائے میں چھپی بات یہ ہے کہ جب یہ دلیل پیش کی جائے گی کہ ہر چیز کو کوئی بنانے والا ہوتا ہے تو پھر براہِ راست یہی سوال خدا کے بارے میں بھی اٹھنا منطقی طور پر جائز ہو جائے گا۔ لہذا سائنس اس ذیل میں مختلف سوال اختیار کرتی ہے۔ اسکا سوال یہ ہے کہ عالم کیسے وجود میں آیا؟ یہ سوال علم کے دروازے بند کرنے کے بجائے کھولتا ہے اور تحقیق کی دعوت دیتا ہے۔ جب کائنات کا مطالعہ اس انداز اور زاویے سے کرتے ہیں تو تغیر و ترقی کا سلسلہ جلو میں چلتا دکھائی دیتا ہے۔ اور یوں ہر چیز کے بارے میں اس سوال کا جواب ملتا چلا جاتا ہے کہ کیسے بنی۔ آج ہم جانتے ہیں کہ کائنات اور اس کے مظاہر جامد و ساکن نہیں ہیں۔ اس کائنات کے ہر مظہر کا رنگ روپ اور صورتِ واقعہ زمان و مکان کے ساتھ جڑے ہیں اور ان سے الگ نہیں ہیں بلکہ زمان و مکان کی تبدیلی سے ان اشیاء کی موجودہ حالت برقرار نہیں رہے گی۔ صرف اسی دھرتی پہ ہی دیکھ لیں کہ کس طرح نباتات معدوم ہوتے ہیں، نئی آتے ہیں اور تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ یہاں کسی کی طرف سے ان کے بنائے جانے کا سوال شاید ہی زیر بحث آتا ہو۔ کیوں کہ اس سوال سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ یہ اشیاء ایک بات بن چکی ہیں اور بس، جبکہ ایسا حقیقت میں نہیں ہے۔ کائنات میں موجود ہر شے لمحہ بہ لمحہ کسی تخلیقی عمل سے گزرتی چلی جاتی ہے یعنی تعمیر و تخریب پہلو بہ پہلو چل رہی ہیں۔

ہر صورت میں قبولیت اور تسلیم کا عنصر کسی مذہب کو حقیقت بناتا ہے۔ لیکن عقائد کی سطح پر انسان اپنے ماحول سے جو عقیدے لیتا ہے انھیں من و عن تسلیم کرتا ہے اور حقیقت سمجھتا ہے۔ انسانوں میں ان عقائد کا مسئلہ یہ ہے کہ کسی ایک مجموعۂ عقائد پر ایمان رکھنے والے کی حیثیت کسی دوسرے مجموعۂ عقائد کے ماننے والے کے نزدیک بالکل صفر ہے۔ یہتصورِ خدا میں تنوع کی ایک بڑی وجہ ہے اور یہ وجہ ہمیشہ سے رہی ہے۔ آسان الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ کسی ایک انسان کے نزدیک سچا عقیدہ کسی دوسرے انسان کے نزدیک باطل ہوتا ہے۔ اس طرح سے دیکھیں تو دو نکات واضح ہیں اول یہ کہ دنیا کے تمام انسان ایک دوسرے کے نزدیک بیک وقت باطل عقائد میں مطمئن زندگی بسر کیے جا رہے ہیں۔ دوم یہ کہ تمام عقائد خود انسان کے زمینی حالات اور اسکے گرد و پیش سے اس تک پہنچتے ہیں اور وہ اپنے عقائد اپنے ماحول سے حاصل کرتا ہے۔ المختصر جب بھی انسان نے بغیر تجزیہ و تنقیدی بصیرت پرکھے کوئی عقیدہ تراشا وہ انسان کو غلط نتائج کی طرف لے گیا جس سے ہماری انسانی تاریخ بھری پڑی ہے۔ ہماری اس رائے کی تائید میں ارشد محمود کا قول دیکھیے:

> ''کسی صداقت کی یہ شرط کہ اس پر پہلے ایمان لایا جائے خود صداقت کی توہین ہے۔ صداقتیں اور حقیقتیں تنقیدی نظر اور معروضی مطالعے سے سامنے آتی ہیں۔ اندھے ایمان سے نہیں۔'' (7)

اگرچہ یہ رائے کسی قدر غصے کا پہلو لیے ہوئے ہے مگر کسی صداقت تک پہنچنے کے لیے درست طریقِ کار کیا ہے اس حوالے سے رہنما اصول بیان کرتی نظر آتی ہے۔ اور یہ بات تو روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ انسان نے ابتدائی ادوار میں بے شمار صداقتوں کے حوالے سے محض قیاس اور واہمے ہی پر انحصار کیا جو اسکے غیر تنقیدی ہونے کی دلیل بھی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ عقائد موضوعی صورت اختیار کرتے چلے گئے۔ ایسے میں ایک بار جو نظریات وضع ہوئے یا عقائد وجود میں آئے انسان نے تمام عمر انھی پر کاربند رہ کر گزار دی۔ جنھوں نے اسکے مرنے کے بعد بھی اسکا پیچھا کبھی نہیں چھوڑا۔ اس بحث سے اب تک یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ عقائد خود انسان کے اپنے تراشیدہ ہیں اور ان عقائد کا مرکزی کردار حضرت انسان اور اسکا شعور ہے۔ اسکی نگاہ نے پتھر کو خدا بنایا تو یہ عقیدہ پیدا ہو گیا اور یوں ایک مفروضہ حقیقت بن گیا۔

بندگی حالت سے ظاہر ہے خدا ہو یا نہ ہو

(اکبر الہ آبادی)[8]

ہم نے تصورِ خدا کو انسانی تاریخ کے تناظر اور فلسفیانہ فکر کی روشنی میں دیکھا۔ دنیا کی تقریباً ہر زبان کے ادب میں اس تصور کو لے کر غور و فکر پایا جاتا ہے۔ چاہے وہ داستان کی اساطیری فضا ہو، ترقی یافتہ زندگی کا عکاس ناول ہو یا افسانہ، ملٹن کی خُلدِ گم گشتہ ہو یا رومی کی صوفیانہ فکر، خدا سے مخاطب ہونا، اس سے ہم کلام ہونا اور شکوہ کرنا یا تصورِ خدا پر تفکر کرنا ہر سطح پر موجود ہے۔

اردو شاعری میں غزل کی بات کی جائے تو ولی دکنی کے ہاں اس تصور پر فارسی اور ہندوستانی تصوف کا سایہ واضح دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً

ہر ذرۂ عالم میں ہے خورشید حقیقی
یوں بوجھ کہ بلبل ہوں ہر اک غنچہ دہاں کا(9)

سجن کے باج عالم میں دگر نئیں
ہمیں میں ہے ولے ہم کوں خبر نہیں(10)

مندرجہ بالا اشعار پڑھ کر دھیان فوراً تصوف کے نظریۂ وحدۃ الوجود کی طرف جاتا ہے۔ مندرجہ بالا پہلے شعر سے یہ معنی بھی برآمد ہوتے ہیں کہ نظریۂ وحدۃ الوجود کو عشقِ مجازی میں عاشق کے ہر جائی پن کا دفاع اور جواز بنا دیا گیا ہے۔ ایک اور زاویے سے دیکھیں تو اس شعر میں وحدۃ الشہودی نظریے کے آثار بھی موجود ہیں۔ گویا یہ شعر تصورِ خدا کے حوالے سے دونوں امکانات کا حامل ہے۔

فی زمانہ سائنس نے دیگر شعبہ ہائے زندگی کی طرح عقائد کے ضمن میں بھی انسان کے سوچنے کا انداز بدل دیا ہے، جیسا کہ اوپر ذکر آ چکا ہے۔ سائنس کے مطابق انسانی ساخت کی بنیادی اکائی ایٹم ہے۔ اور ایٹم کی ساخت یا ڈھانچہ کائنات میں موجود ستاروں کے نظام کے مشابہ ہے۔ امکان یہ ہے کہ انسان کی جسمانی ساخت میں بھی مختلف نظام موجود ہیں (جیسا کہ ایٹمز) جو کہ اس کے وجود سے باہر موجود کائناتی نظاموں کے مماثل ہیں۔ طبعیاتی ماہرین کے مطابق انسانی جسم میں ستاروں کی راکھ (Star Dust) کے ذرات (Traces) ملے ہیں جو کہ اس بات کا مظہر ہیں کہ انسان کے اندر کی کائناتیں اور انسان کے باہر کی کائناتیں جوہری طور پر ایک ہی ہیں۔ بقول عارفہ بتول:

"تاریخ کائنات میں انسان ہی وہ واحد مخلوق ہے جس نے تہذیب و ثقافت، معیشت و معاشرت اور علم و سائنس کے ارتقا میں اپنی صلاحیت اور لیاقت کے ان مٹ نقوش مرتب کیے ہیں۔ یہ انسانی عظمت کا اعتراف ہی تو ہے کہ انسان کو کبھی 'کائناتِ اصغر (Micro cosmos)' کہا گیا تو کبھی وہ 'کائناتِ اکبر (Macro cosmos)' کا عکس یا پرتو قرار پایا۔[11]

تاریخ بتاتی ہے کہ انسان نے بپھرتے ہوئے مظاہر فطرت کو دیوتاؤں کی غضب ناکی سمجھا اور ان کو خوش کرنے کے لیے کئی جتن بھی کیے۔ دیوتا خوش ہوئے تو انسان کے دوست بنے اور انسان کو نوازا، اس کی حفاظت کی۔ تصورِ خدا کو لے کر فکرِ انسانی کا یہ دور اب اس کے اجتماعی لاشعور کا حصہ ہے۔ جو فنون میں ظہور پاتا رہتا ہے۔ خدا کا قہار و جبار ہونا بھی اسی کا تسلسل سمجھا جاسکتا ہے۔ حیدر علی آتش کے مندرجہ ذیل شعر میں خدا کو دوست بتایا جانا اس بات کا واضح اشارہ ہے کہ خدا اس شعر میں موجود کردار سے خوش ہے اور ہزار دشمن بھی ہوں تو اس دوست (خدا) کی مدد سے حصول منزل ذرا بھی مشکل نہیں۔

مقام تک بھی ہم اپنے پہنچ ہی جائیں گے
خدا تو دوست ہے دشمن ہزار راہ میں ہے [12]

یہاں پر تصور خدا کے متعلق دو نکات واضح ہیں۔ اول خدا کا قادر ہے، ساری کائنات سے طاقت ور ہے اور دوم ایک خدا جس کا دوست ہے، اسکے مد مقابل آنے والی، اسے نقصان پہنچانے والی قوتوں کا دشمن ہے۔

نظر آتی ہیں ہر سو صورتیں ہی صورتیں مجھ کو
کوئی آئینہ خانہ کارخانہ ہے خدائی کا[13]

آتش کا مندرجہ بالا شعر تصوف کے اس نظریے کا عکاس ہے کہ تمام مخلوقات (صورتیں) ایک ہی حقیقت کا اظہار ہیں۔ گویا آتش کے ہاں تصورِ خدا متصوفانہ خیالات پر مبنی ہے۔ اس کی وجوہات اور محرکات میں ہندوستان کے تہذیبی عناصر اور فارسی شاعری کے اثرات ہیں۔

میر تقی میر کے ہاں یہ تصور ایسے انداز میں بیان ہوتا ہے کہ میر تصوف کا سب سے بڑا شاعر لگنے لگتا ہے۔ مندرجہ ذیل شعر حمدیہ انداز میں صوفیانہ فکر اور خاص طور پر وحدۃ الشہودی نظریے سے متاثر نظر آتا ہے۔

تھا مستعار حسن سے اسکے جو نور تھا
خورشید میں بھی اسکا ہی ذرہ ظہور تھا[14]

جس طرح کلاسیکی فلسفہ کے بعد ابھرنے والی فکر نے کائنات میں موجود جاری و ساری کسی عظیم روح کا کھوج لگایا تھا اسی طرح اس شعر میں بھی تیقین کے ساتھ وہی دعوی دوہرایا گیا ہے۔

شعر میں لفظ "تھا" اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے گویا یہ بات زیرِ بحث رہی ہے کہ اس متحرک اور روشن و تاریک کائنات کے گوشے گوشے اور ذرے ذرے میں کس نے رنگ روپ بھرے ہیں۔ اور بالآخر یہ نتیجہ نکالا گیا ہے اور

اس بحث کے اختتام پر یہ مان لیا گیا ہے کہ خورشید یعنی روشن کائنات میں بھی اسی (خدا/ خالق) کے حسن مطلق کا ذرہ ظہور تھا۔

کئی مقامات پر میر کے ہاں تصوفانہ خیالات کے بیان کے ساتھ ساتھ خدا کو انسان اور کائنات کے حوالے (Reference) سے سمجھنے کی روش بھی نظر آتی ہے۔

اردو شاعری میں تصورِ خدا کی یہ کونیاتی (Cosmic) جہت بھی میر کے ہاں مندرجہ ذیل نمایاں فلسفیانہ پیرائے میں بیان ہوئی ہے۔ ہاں البتہ میر ایسا مضمون باندھتے ہوئے بھی شعریت کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

پہنچا جو آپکو تو میں پہنچا خدا کے تئیں
معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دور تھا[15]

بالذات ہے جہاں میں وہ موجود ہر جگہ
ہے دید چشم دل کے کھلے عین ذات کا[16]

یہ دو ہی صورتیں ہیں یا منعکس ہے عالم
یا عالم آئینہ ہے اس یار خود نما کا[17]

درج بالا اشعار میں میر نے خدا کے تصور کو انسان اور کائنات سے جوڑ کر سمجھنا چاہا ہے یا اسکا تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ روش کہ جس میں خدا کے تصور کو دونوں فلسفیانہ نظریات یعنی وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کے دائرے میں رکھ کر پیش کیا گیا ہے یہ میر درد کے ہاں کلی اسلوب بن کر ابھرا ہے۔ دیگر شعرا کے ہاں بھی ان نظریات کا بیان پایا جاتا ہے۔

میر کے بعد کے شعرا کے ہاں بھی ایسے اشعار کثرت سے ملتے ہیں جن میں مذہبی فکر کے زیرِ اثر خدا کے متعلق اور اسکے وجود کے متعلق حمدیہ یا تجزیاتی اسلوب اپنایا گیا ہے۔ بلکہ یوں کہنا بھی غلط نہ ہو گا کہ تصورِ خدا پر بلا امتیازِ مذہب تقریباً ہر شاعر کے ہاں اشعار مل جاتے ہیں۔ اردو مثنوی کی روایت میں تو اسکی بہترین مثالیں ہیں۔

دیا شنکر نسیم کی مثنوی "گلزارِ نسیم" [18] دیکھی جا سکتی ہے۔ بہر حال میر کے بعد اردو شاعری کی روایت میں غالب کے ہاں جس فلسفیانہ اسلوب کا ظہور ہوا ہے اس نے تصورِ خدا کے باب میں بہت فکر انگیز اضافے کیے ہیں۔ غالب ایسا شاعر ہے جس نے اس موضوع کو نئے انداز سے دیکھا اور خدا کے وجود پر قلم اٹھایا تو فلسفہ کے ڈسپلنز اس کے ہاں بنتے دکھائی دیے۔ غالب کے فلسفیانہ لہجے کی سب سے اہم بات سوال قائم کرنا ہے۔ اور پھر اس سوال کا جواب قاری کو تہ در تہ کائنات، انسان اور خدا کے تصور تک بتدریج پہنچاتا ہے۔

غالب اس تصور میں مذہبی فکر کے ماتحت تو ہے اور تسلیم بھی کرتا ہے کہ خدا ہے لیکن کثرت، وحدت اور کائناتی مسائل سے الگ کر کے نہیں بلکہ اس کے ہاں خدا کا تصور کائنات کو مرکز میں رکھ کر سامنے آتا ہے۔

جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟(19)

کثرت آرائی وحدت ہے پرستاری وہم
کر دیا کافر ان اصنام خیالی نے مجھے (20)

غالب کا درج ذیل مشہور شعر:

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا(21)

پہلی قرأت میں خدا کے بارے میں متصوفانہ نظریے کا حامل نظر آتا ہے۔ غالب اگرچہ خالصتاً فلسفی نہیں ہے مگر اُس نے وجودِ خدا پر فلسفیانہ استدلال کیے ہیں۔ غالب کے مندرجہ بالا اشعار میں انسانی واہمہ اور خدا کے تصور کو بیان کیا گیا ہے اور اصنامِ خیال کا ذکر بھی واضح ہے۔ یہ اسی قدیم انسانی فکر کی نمائندگی ہے جس نے بغیر تنقیدی بصیرت کے محض فطرت سے خوفزدہ ہو کر ہر طاقتور چیز کو انسانی کیفیات پہنائیں اور پھر اس کے غصے سے بچنے کے لیے انہیں خدا تسلیم کر لیا۔ ایک شعر میں یہ بھی واضح ہے کہ وہ خدا سے براہِ راست مکالمہ اور سوال کر رہے ہیں کہ یہ ہنگامہ آرائیِ کائنات اور مطلق طاقت کی جنگ کیوں ہے۔ یہی خیال آگے چل کر جدید شاعری میں استعارہ بن جاتا ہے۔

غالب کا مندرجہ بالا شعر جس میں ''یگانہ ہے وہ یکتا'' کی بندش موجود ہے وہ خدا کے مروجہ تصور اور فلسفۂ وحدانیت کے ساتھ ساتھ قدرے مذہبی فکر کی نمائندگی کرتی ہے۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا(22)

غالب کا یہ شعر کثیر المعانی ہے جن میں سے ایک معانی یہ ہیں کہ مخلوق (نقش) شکایت کناں ہے کہ اُسے کاغذی یعنی ناپائیدار اور کمزور پیکر بنا کر اس کے ساتھ شوخی (مذاق) کیا گیا ہے۔ یاد رہے کہ یہ غالب کے دیوان کا پہلا شعر ہے اور اردو شاعری کی روایت میں دیوان کا اولین شعر اکثر حمدیہ ہوتا ہے۔ غالب نے اس روایت سے انحراف کرتے ہوئے شکوے کو حمد کا قائم مقام بنا دیا۔ کیونکہ شکوہ بذاتِ خود کسی کی طاقت، حاکمیت اور قدرت کو تسلیم بھی کر رہا ہوتا ہے۔ غالب کا یہ انداز مندرجہ ذیل شعر میں مزید نکھر کر سامنے آتا ہے:

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند

گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں[23]

اقبال کی نظم ''شکوہ'' [24] غالب کے مندرجہ بالا شعر کی تشریح معلوم ہونے لگتی ہے۔ جس میں خالق و مخلوق بہت قریب نظر آتے ہیں۔ یہاں انسان اور خدا بلکہ ایک خاص طبقۂ فکر کا انسان اور خدا ہم کلام ہیں۔ شکوہ و جوابِ شکوہ کے علاوہ بھی دیکھیں تو اقبال مذہبی فکر کے زیرِ اثر بھی کئی خیالات کا اظہار کرتے ہیں جس میں خدا بطور خالقِ کائنات اور خالقِ انسان کے طور پر نظر آتا ہے۔ اس طرح اقبال کا تصورِ خدا ان عقائد کی ذیل میں آجاتا ہے جنھیں انسان اپنے ماحول سے اخذ کرتا ہے اور پھر اسی ماحول کی تعلیمات اسے مزید پختہ کرتی اور نکھارتی ہیں۔

جہاں اگرچہ دگرگوں ہے قُم باذن اللہ
وہی زمیں، وہی گردوں ہے قُم باذن اللہ[25]

اقبال نے اس ذیل میں ایک جگہ اکتائے ہوئے انسان کا مؤقف بھی سامنے رکھ دیا ہے:

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا
یا اپنا گریباں چاک یا دامنِ یزداں چاک[26]

اقبال کے بعد ن۔م۔ راشد ایسا شاعر ہے جو شعری لفظیات اور نظریۂ فن کے حوالے سے بہت منفرد ہے اور اس نے اپنی جدتِ طبع کے تحت اردو شاعری کا رنگ ہی بدل کر رکھ دیا اور ایسے خیالات باندھے جو اِس پہلے اردو شاعری کے پاس بالکل بھی نہیں تھے۔ صرف یہی نہیں ن۔م۔ راشد نے اپنے ان خیالات کے اظہار کے لیے میڈیم بھی نیا اپنایا۔

راشد کا تصورِ انسان اور تصورِ خدا اردو شعری دنیا میں بالکل نیا، منفرد اور چونکا دینے والا تھا۔ راشد نے خدا کو استعارہ بنا دیا۔ اُس کے ہاں جہاں جہاں تصورِ خدا بیان ہوا ہے ہر مقام پر پہلے سے الگ ہے۔ کہیں اس نے اسے طاقت کے استعارے کے طور پر دیکھا ہے، کہیں قدیم اور دقیانوسی فکر سے مملو ہونے کی بنیاد پر طنز کا نشانہ بنایا ہے تو کہیں انسانی ریفرنس سے اسے پیش کیا ہے۔

اس بات پر بہت اعتراض بھی ہوتا رہا کہ راشد نے ''بیکار خدا'' [27] کی ترکیب کا استعمال کر کے ملحد ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ لیکن ادبی اندازِ فکر اس بات پر اس طرح کی قطعی فیصلہ سازی کو قبول نہیں کرتا۔

یہ بھی کہا گیا کہ نٹشے نے جو کہا تھا کہ ''خدا مر چکا ہے'' تو راشد اس فکر کا چربہ کرتا ہے۔ لیکن حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ راشد کے کلیات میں موجود نظم ''انسان'' [28] پہلی نظم ہے (کلیات کی ترتیب کے لحاظ سے) جس میں راشد کا تصورِ خدا دکھائی دیتا ہے۔ اس نظم میں راشد کی توجہ خدا سے زیادہ انسان پر ہے اور یہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے انسان پر طنز ہے جو ہر کام میں خدا کی طرف سے کسی مدد کا منتظر ہے۔ نظم ''اتفاقات'' [29] میں ایک زندگی کی کلفتوں سے مفرور اور اپنے تئیں ہر لحاظ سے خود کو آسودگی میں غرق کر دینے والا ماحول ہے۔ جس میں وصال کی گھڑیاں ہیں اور یہ سطریں کہ:

''تجھ کو اس سے کیا غرض ہے کہ خدا ہے یا نہیں
۔۔۔ آ اسی لذتِ جاوید کا آغاز کریں

شبنمی گھاس پہ دو پیکرِ یخ بستہ ملیں
اور خدا ہے تو پشیماں ہو جائے"

یہ نظم خدا کو ایک ایسی طاقت کے استعارے کے طور پر پیش کر رہی ہے جو انسان کے کئی پہلوؤں پر قدغنیں لگاتی ہے۔ گویا اخلاقی و معاشرتی نام نہاد اقدار بھی خدا ہیں جنھیں راشد پشیماں کر دینا چاہتا ہے۔

المختصر جدید اردو شاعری میں تصورِ خدا کئی نئے پیرائیوں میں پیش ہوا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر کئی مہا بیانیوں پر چوٹیں کی گئیں اور کئی آفاقی سمجھے جانے والے تصورات کی توڑ پھوڑ ہونے لگی۔ ت اہم بہت سے شاعر جو ترقی پسند تحریک کا حصہ نہیں تھے لیکن ان کے ہاں بھی ترقی پسند عناصر پائے جاتے ہیں۔ ایسے ہی ایک شاعر مجید امجد ہیں۔ مجید امجد کو خواجہ محمد زکریا نے اقبال کے بعد سب سے بڑا فلسفی شاعر قرار دیا ہے۔ اسکی دیگر وجوہات سمیت ایک وجہ مجید امجد کا تصور خدا ہے۔ اس سلسلے میں مجید امجد کے بارے میں خواجہ محمد زکریا کے ایک قول کا تجزیہ کرتے ہیں:

''مجید امجد کے ہاں وقت خدا کے متبادل کے طور پر بیان ہوا ہے۔'' (30)

اس رائے کو سامنے رکھیں تو دو باتیں سامنے آتی ہیں۔ اول یہ کہ مجید امجد خدا کو وقت کی عظیم طاقت کے طور پر دیکھتا ہے۔ دوم یہ کہ تصورِ خدا مجید امجد کے ہاں وقت کے فریم میں بیان ہوتا ہے۔ فلسفیانہ فکر کا ایک دھارا اس بات کا قائل رہا ہے کہ خدا کا تصور زمان و مکان کے دائرے میں آتا ہے۔ خدا اگر موجود ہے تو پھر وہ کسی زمان کسی مکان کا محتاج بھی ہے۔ مجید امجد کی مندرجہ ذیل نظم سے اس کے تصورِ خدا کا ایک اور نکتہ بھی سامنے آتا ہے۔ نظم ملاحظہ کریں:

" خدا"

(ایک اچھوت ماں کا تصور)

خبر ہے تجھ کو کچھ، رُلدو! مرے ننھے! مرے بالک!
ترا بھگوان پرمیشر ہے اس سنسار کا پالک!

کہاں رہتا ہے پرمیشر؟ ادھر آکاش کے پیچھے
کہیں دور، اس طرف تاروں کی بکھری تاش کے پیچھے

نہیں دیکھا؟ سویرے جوں ہی مندر میں گجر باجا
پہن کر نور کی پوشاک وہ من موہنا راجا

لئے "سونے کا چھابا" جب ادھر پورب سے آتا ہے
تو ان تاروں کی پگڈنڈی پہ جھاڑو دے کے جاتا ہے

نہیں سمجھے کہ اتنا دور کیوں اس کا بسیرا ہے؟
وہ اونچی ذات والا ہے اور اونچا اس کا ڈیرا ہے

یہ دنیا والے، یہ امرت کے رس کی چھاگلوں والے
یہ میٹھے بھوجنوں والے، یہ اجلے آنچلوں والے

یہ اس کو اپنی لاشیں اپنے مردے سونپ دیتے ہیں
عفونت سے بھرے دل اور گردے سونپ دیتے ہیں

جنہیں دوزخ کے زہروں میں بھگو کر بھونتا ہے وہ
جنہیں شعلوں کی سیخوں میں پرو کر بھونتا ہے وہ

یہ اس بھگوان کے دامن کو چھو لینے سے ڈرتے ہیں
یہ اس کو اپنے محلوں میں جگہ دینے سے ڈرتے ہیں

کسی نے بھول کر اس کا بھجن گایا، یہ جل اٹھے
کہیں پڑ بھی گیا اس کا حسین سایا، یہ جل اٹھے

غلط کہتا ہے تو نادان تو نے اس کو دیکھا ہے
مرے بھولے! ہماری اور اس کی ایک لیکھا ہے (31)

اس نظم میں خدا کا تصور ایسے پسے ہوئے انسانی طبقے سے ابھرا ہے جو سماجی، معاشرتی، وجودی اور روحانی، غرض یہ کہ ہر طرح کے استحصال کا شکار ہے۔ نظم مکالمے کی طرح شروع ہوتی ہے اور اچھوت ماں کے اپنے بیٹے (رلدو) کو مخاطب کرنے کے انداز سے نظم کا ماحول ایسا بنتا ہے گویا رات کے وقت ماں خاموشی سے آسمان کو دیکھ کر سوچ رہی تھی اور پھر پاس موجود بیٹے کو مخاطب کر کے کہا کہ تیرا بھگوان پرمیشر اس سنسار کا پالنے والا ہے۔ یہ مصرعے ایک فرد کے پاس موجود خدا کے تصور کا کسی دوسرے فرد کو منتقل ہونا دکھاتے ہیں۔ یہ تصور منتقل کرنے والا فرد ایک شفیق ماں اور اپنے بیٹے کے لیے مؤثر شخصیت ہے۔ گویا نظریات و تصورات مؤثر شخصیات کے ذریعے سفر کرتے ہیں۔ ان مصرعوں کے بعد

''کہاں رہتا ہے پرمیشر '' کے سوال میں جو معصومانہ تجسس موجود ہے اس سے یہ لگتا ہے کہ یہ سوال رلدو (بچے) نے ماں سے پوچھا۔ جس کے جواب میں ماں اسے بتاتی ہے کہ وہ آکاش کے پیچھے بہت دور ستاروں کے پیچھے رہتا ہے۔ اس مکالمے سے خدا کا انسان سے بہت دور ہونا اور اونچا ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ مگر یہ بلندی، یہ رفعت و مرتبت چونکہ ایک اچھوت ماں کے احساسات سے جڑی ہے اس لیے اسکے نزدیک خدا من موہنا راجہ تو ہے جو صبح سویرے نور کی پوشاک پہن کر پورب سے آتا ہے۔ لیکن اسکے معمولات اچھوت ماں والے ہیں بس فرق یہ ہے کہ اسکے ہاتھ میں سونے کا چھابا ہوتا اور وہ ستاروں کی پگڈنڈی پر جھاڑو دیتا ہے۔ وہ اتنی دور کیوں رہتا ہے کے جواب میں ماں بتاتی ہے کہ وہ اونچی ذات والا ہے۔ گویا ایک اچھوت ماں اور خدا میں بس "ذات" کا فرق ہے۔ وہ اونچی ذات والا ہے اور یہ نیچ ذات یعنی اچھوت ہے۔ آگے چل کر دنیا والوں کا خدا کے ساتھ جو رویہ بیان ہوا ہے وہ وہی ہے جو سماج کا اس اچھوت ماں کے ساتھ ہے۔ اس سب سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ خدا کو انسان نے اپنی سماجی حیثیت، معاشرتی استعداد اور ثقافتی تناظر میں ہی سمجھا ہے۔

ہم نے دیکھا کہ کس طرح انسانی ذہن کے غیر ناقدانہ عمل سے مائتھالوجی یا دیومالائی قصے کہانیوں نے جنم لیا۔ یہ دیومالائی قصے کہانیاں ہر زبان کے ابتدائی ادوار کا ادبی سرمایہ ہیں۔ یہ قصے کہانیاں ہمیں انسان کے سادہ وجود اور سادہ ذہن تک رسائی دیتے ہیں جس سے یہ سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ قدیم انسان کے عقل و ذہن کے مطابق حقیقت کی ماہیت کیا تھی اور اس قدیم انسان نے خدا کا تصور کس طرح تراشا۔ بعد ازاں انسانی ذہن و شعور کے ارتقا کے ساتھ ساتھ اسکے تصورات بشمول تصور خدا، ارتقا پاتے رہے۔ اردو شاعری میں بھی تصور خدا کو لے کر اسی طرح ارتقا ہوا ہے۔ کلاسیکی شاعری میں یہ تصور برصغیر کی متصوفانہ فضا، مذہبی عقائد کے دائروں میں بیان ہوتا رہا ہے۔ میر کے ہاں اس تصور میں یہ تبدیلی آئی کہ ان کے اشعار میں خدا کو کائنات اور انسان کے ریفرنس سے سمجھنے کی کوشش نظر آتی ہے۔ غالب نے خدا کے بارے میں فلسفیانہ تفکر کیا، سوالات اٹھائے تجسس کا اظہار بھی کیا اور اپنی شعری کونیات ترتیب دی جس میں خدا، کائنات اور انسان مرکزی نکتہ ہیں۔ اقبال کے ہاں بھی اس تصور پر کئی مضامین موجود ہیں جن میں کچھ غالب کے چھیڑے گئے مباحث کا تسلسل اور توسیع ہیں۔ راشد اور مجید امجد کے ہاں خدا متعدد معانی کا حامل استعارہ بن جاتا ہے اور عصر حاضر کے شعرا بھی اس استعارے سے تسلسل سے کام لے رہے ہیں۔

حوالہ جات

1. گوپی چند نارنگ، پرانوں کی کہانیاں، نئی دہلی: نیشنل بک ٹرسٹ، ۱۹۷۶ء، ص:۱۰
2. ارشد محمود، تصورِ خدا، نئی دہلی: انجمن ترقی اردو (ہند)، ۱۹۹۷ء، ص: ۱۰
3. عشرت رحمانی، اونچے نشاں والے، حیدر آباد: مسعود پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۴۶ء، ص:۲۳
4. ارشد محمود، تصورِ خدا، نئی دہلی: انجمن ترقی اردو (ہند)، ۱۹۹۷ء، ص: ۲۵
5. ایضاً، ص: ۲۵
6. علی عباس جلالپوری، کائنات اور انسان، لاہور: تخلیقات پبلشرز، ۱۹۹۹ء، ص: ۴۵
7. ارشد محمود، تصورِ خدا، نئی دہلی: انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۹۷ء، ص:۲۷
8. اکبر الہ آبادی، کلیاتِ اکبر الہ آبادی، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ۲۰۰۲ء، ص:۴۳۹
9. ولی دکنی۔ کلیات ولی، مرتبہ نور الحسن ہاشمی، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۰۸ء، ص: ۶۱
10. ایضاً، ص ۲۰۵
11. عارفہ بتول، ''جدید اردو نظم میں تصوّرِ انسان''، مقالہ برائے پی ایچ ڈی، مخزونہ پنجاب یونیورسٹی، 2016، ص ۱۳:
12. خواجہ محمد زکریا، انتخاب زریں اردو غزل، لاہور: سنگت پبلشرز، ۲۰۰۹ء، ص:۱۰۵
13. حیدر علی آتش، کلیاتِ آتش، لاہور: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۳ء، ص: ۴۱
14. میر تقی میر، کلیاتِ میر، مرتبہ: یوسف مثالی، لاہور: عبد اللہ اکیڈمی، ۲۰۱۲ء، ص: ۱۱
15. ایضاً، ص:۱۱
16. ایضاً، ص:۲۴
17. ایضاً، ص: ۴۹۵
18. پنڈت دیا شنکر نسیم، مثنوی گلزارِ نسیم، مرتبہ: رشید حسن خان، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۱۱ء، ص:55
19. اسد اللہ خان غالب، دیوانِ غالب نسخہ حمیدیہ، مرتبہ: پروفیسر حمید احمد خان، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۱۸ء، ص: ۲۵۲
20. ایضاً، ص: ۱۱۲
21. ایضاً، ص: ۸۵
22. ایضاً، ص: ۸۵

23. اسد اللہ خان غالب، دیوان غالب جدید، مرتبہ: مفتی محمد انوار الحق، بھوپال: مدھیہ پردیش اردو اکادمی، ۱۹۲۱ء، ص:۲۷۸

24. محمد اقبال، کلیاتِ اقبال، لاہور: دی کو لیکشنز، ۲۰۰۲ء، ص :۱۲۶

25. محمد اقبال، کلیاتِ اقبال، ص: ۵۷

26. محمد اقبال، کلیاتِ اقبال، ص: ۳۷

27. ن۔م راشد، کلیاتِ راشد، لاہور: ماورا پبلیکشنز، ۱۹۹۱ء، ص: ۹۷

28. ایضاً، ص:۲۴

29. ایضاً، ص: ۶۷

30. مجید امجد، کلیاتِ مجید امجد، مرتبہ: خواجہ محمد زکریا، لاہور: الحمد پبلیکیشنز، ۲۰۲۱ء، ص: ۶

31. ایضاً، ص: ۵۰